⊙ ماہ رُخ

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

⊙⊙ ڈاکٹر محمد ارشد اویسی

پروفیسر (ریٹائرڈ)، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

⊙⊙⊙ ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی

پروفیسر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

مارکسی نظریہ اور اردو کے بنیاد گزار مارکسی ادیب

Abstract:

Marxism is a philosophy that defines the world based on concrete and solid grounds and the society lives in that world. It opposes the idealistic approach which presents a spiritual world and its life. Marxism from its beginning was a great deviation from all the political, economical and social philosophies that came before it. It conceptualizes that every society in fact progresses through the struggle between opposing forces and this struggle results in social transformation. This article tries to define and interpret the philosophy of Marxism shortly and then discusses the life and work of the very first literary figures of Urdu who adopted this philosophy in their political and social struggle and presented it in their writings.

Keywords:

Marxism Class Struggle Marxist Literary Sardar Jaffery Abdul Aleem Akhtar Raipuri

یوں تو انسانی فکر کی تاریخ میں کئی نامور مفکر ہو گزرے ہیں لیکن اگر تاریخ کے عظیم ترین مفکروں کا نام لیا جائے تو افلاطون، ارسطو اور ہیگل کے بعد جو نام آتا ہے وہ جرمن مفکر اور سائنسی کمیونزم کے بانی کارل مارکس کا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ مارکس کے فلسفے، سائنس، معاشیات، سیاسیات، سماجیات، لسانیات، ریاضی اور تاریخ کے میدانوں میں برپا کیے گئے

کارناموں کا تسلی بخش احاطہ ایک مضمون میں کیا جا سکے۔ تاہم اس مضمون میں چیدہ چیدہ مارکس کے ان افکار اور دریافتوں کا ذکر کریں گے جو ان کے مکتبِ فکر، مارکس ازم، میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ فلسفے کے میدان میں مارکس نے اپنے ہم وطن اور فلسفے میں دیوہیکل قد وقامت رکھنے والے فلسفی ہیگل کی 'منطق کی سائنس' کو خیال پرستانہ روش سے آزاد کر کے اسے حقیقی سائنسی بنیاد پر کھڑا کیا، مادیت پسندی اور مثالیت پسندی میں تقسیم علمِ فلسفہ میں ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی جسے جدلیاتی مادیت کہا جاتا ہے اور پچھلے تمام فلسفیوں کے برعکس جو خواہ مادیت پسند ہوں یا خیال پرست، فلسفے کو خیال کے تجریدی عشق سے نکال کر اس میں موجود 'روح لافانی ہے یا جسم؟' یا 'ذہن بنیادی ہے یا مادہ؟' جیسے ہمیشہ سے چلے آ رہے دوہرے پن کو انسان کی عملی سرگرمی سے یعنی محنت کے عمل سے جوڑ کر فلسفے کو عمل کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ مارکس کا شہرۂ آفاق مقولہ ہے: ''فلسفیوں نے اب تک بس دنیا کی تشریح کی ہے لیکن اصل نکتہ تو اس کو بدلنے کا ہے''۔ جدلیاتی مادیت کے قوانین کا علمِ تاریخ پر اطلاق کرتے ہوئے مارکس نے تاریخ کے ارتقاء کا قانون دریافت کیا اور اس سوال کا سائنسی جواب فراہم کیا کہ انسانی معاشرہ کن وجوہات کی بنیاد پر ترقی کرتا اور آگے بڑھتا ہے۔ انہوں نے معاشی ضروریات کی تسکین کو انسانی تاریخ کے ارتقاء کے محرک کے طور پر تلاش کیا اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انسان کی محنت کو بنیادی عنصر کے طور پر دریافت کیا۔ مارکس کے نزدیک انسان کی معاشی ضرورتیں انسان کو غور وفکر کرنے، آلات واوزار ایجاد کرنے، قدرتی وسائل کو استعمال میں لانے اور زندگی کو بہتر بنانے پر، الغرض انسان کو زینی اور جسمانی محنت کرنے ہی پر اکساتی ہیں اور محنت کے اس عمل میں انسان معاشرے کو بہتر سے بہتر بناتا رہتا ہے۔

مارکس کے مطابق انسانی معاشرے کی بنیاد اس کا معاشی نظام ہوتا ہے۔ جس طرز کا معاشی نظام ہوتا ہے معاشرے میں اسی سے مطابقت رکھنے والے سماجی رشتے، خیالات، اخلاقی و جمالیاتی اقدار، قوانین، آرٹ وغیرہ تشکیل پاتے ہیں۔ مثلاً قدیم انسانی معاشرے کا طرزِ معاشرت، خیالات، اقدار اور فنون آج کے معاشرے سے یکسر مختلف تھے۔ جاگیرداری عہد کے انسان شعوری، تیکنیکی، اخلاقی و جمالیاتی قدروں کے اعتبار سے آج کے جدید دور کے انسان سے مختلف خیالات، میلانات اور رجحانات رکھتے تھے۔ مارکس کا تعلق چونکہ یورپ کے صنعتی دور سے تھا لہٰذا انہوں نے تاریخی ارتقاء کے قانون کا اطلاق اپنے عہد کے معاشی نظام اور اس سے پیدا ہونے والے معاشرے پر کیا اور 'قدرِ زائد' کا قانون دریافت کیا جس کے مطابق گزشتہ استحصالی معاشی سماجی نظاموں کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں حکمران سرمایہ دار طبقہ اشیائے صرف کی پیداوار کے عمل کو اور خود انسان کی محنت کو بازاری جنس میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مزدور کو اس کی کل محنت کی آدھی اجرت ملتی ہے اور بقیہ آدھی اجرت سرمایہ دار صنعتکار اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ مزدور کی محنت کے اس استحصال سے سرمایہ دار کی دولت پیدا ہوتی ہے۔

مارکس سے قبل ماہرینِ معاشیات کے سامنے یہ بنیادی سوال تھا کہ آخر جدید انسانی معاشرے میں، صنعتی معاشرے میں، پرانے معاشرے سے وجود میں آنے والا سرمایہ دار طبقہ یعنی صنعتکار جو انسانی معاشرے میں پہلے کبھی موجود نہیں تھا وہ اپنی دولت کہاں سے اور کس طرح حاصل کرتا ہے؟ مارکس وہ پہلے فلسفی اور ماہرِ معیشت تھے جس نے جدید معاشیات کے اس بنیادی سوال کا جواب صنعتی پیداواری عمل میں 'قدرِ زائد' کو دریافت کر کے کھوج نکالا۔ اس کے ساتھ

مارکس نے سرمایہ دارانہ معیشت پر استوار جدید انسانی معاشرے میں اس مخصوص معاشی نظام سے پیدا ہونے والے سماجی رشتوں، اخلاقی و جمالیاتی اقدار، ریاستی قوانین، ثقافت اور علوم وفنون کا بھی بھرپور تجزیہ پیش کیا اور دکھایا کہ سرمایہ دارانہ سماج میں ہر شے بکاؤ مال بن جاتی ہے اور سرمایہ دار طبقے کی دولت کی ہوس بہترین انسانی خیالات، رشتوں، اقدار اور ضابطوں کو تباہی و بربادی سے دوچار کر دیتی ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص پیسے کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور پیسے کی خاطر گھٹیا سے گھٹیا سطح کے کام کرنے پر یا تو اپنی معاشی تنگدستی کی وجہ سے یا پھر اپنی دولت میں مسلسل اضافے کی ہوس کی وجہ سے مبتلا ہے۔ خودغرضی، لالچ، دھوکہ دہی، منافقت، کرپشن، اقربا پروری، رشوت ستانی، جھوٹ، فریب، مقابلے بازی، ظلم، ناانصافی، جعلسازی الغرض سماجی، اخلاقی اور قانونی اقدار کی تنزلی عام ہو چکی ہے۔ انسانی ضروریات کی تمام چیزیں کاروبار بن چکی ہیں۔ مارکس نے اس فلسفیانہ معمے کو بھی حل کیا کہ انسان کی ترقی کا دارومدار اس کے شعور پر، اس کی سوچ پر ہے یا معاملہ اس سے مختلف ہے؟ مارکس نے یہ دکھایا کہ انسان کے شعور اور اس کے حالاتِ زندگی میں جدلیاتی ربط ہے۔ انسان کی سوچ اس کے سماجی ماحول سے پنپتی ہے اور اسی کی عکاسی کرتی ہے۔ مثلاً انسان اسی قسم کے خیالات، رویے اور رجحانات اپناتا ہے جو اس کی گھریلو تربیت اور تعلیم کے ذریعے اسے سکھائے جاتے ہیں۔ جب سماجی میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو انسان اس سے مطابقت رکھنے والے خیالات تشکیل دیتا اور اختیار کرتا ہے اور پھر ان خیالات کے تحت عملی سرگرمی سے سماجی تبدیلی کی ضرورت کو پورا کرنے کا عمل سرانجام دیتا ہے۔ انسان کا عمل نئے حالات پیدا کرتا ہے اور پھر ان نئے حالات سے پیدا ہونے والے فکری و عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انسان نئے خیالات کی تشکیل اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے۔ مارکس کا مشہور قول ہے کہ انسان کا شعور اس کے سماجی وجود کا تعین نہیں کرتا بلکہ اس کا سماجی وجود (سماجی حالات اور سماجی رشتے) اس کے شعور کا تعین کرتا ہے۔

مذہب یا شعور کی کسی بھی دوسری قسم کی تبدیلی کے بارے میں مارکس کا یہ سائنسی نکتہ نظر نہایت اہم ہے۔ اکثر مارکس پر اور اس کی فکر پر عمل پیرا کمیونسٹوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ مذہب کے خلاف ہیں اور اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محض ایک الزام ہے۔ مذہبی شعور، انسانی شعور کی ایک قدیم ترین شکل ہے۔ یہ بھی شعور کی دیگر قسموں کی طرح مخصوص سماجی حالات اور سماجی رشتوں کی پیداوار ہے۔ جب یہ سماجی حالات اور سماجی رشتے بدل جائیں گے تو ان کے ساتھ مذہبی شعور بھی خود کو تبدیل کر لے گا۔ اس کے لیے کمیونسٹوں کو کوئی سازش یا جبر یا خاص منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت نہیں۔ سماجی حالات کی تبدیلی سے، معاشی اور سماجی خوشحالی اور سائنسی تعلیم کے نتیجے میں لوگ رفتہ رفتہ خود ہی اپنے ترقی یافتہ فہم وشعور اور تجربے کی روشنی میں اپنے مذہبی و غیر مذہبی عقائد کی قسمت کا فیصلہ کر لیں گے۔ سیاست کے میدان میں مارکس نے طبقاتی جدوجہد کی اقلیم میں سائنسی سوشلزم کے نظریے کی داغ بیل ڈالی اور اپنے سے پہلے آنے والے کمیونسٹ مفکروں کے فکری نقائص کو دور کر کے خیالی سوشلزم کو سائنسی بنیاد پر استوار کیا۔ اس میدان میں مارکس نے مزدور طبقے کی آمریت (مزدوروں اور محنت کش عوام کی حکومت) کو دریافت کیا اور یہ دکھایا کہ تمام انسانی تاریخ کے ارتقاء میں مختلف معاشی سماجی نظاموں میں پیدا ہونے والے مخصوص محنت کش طبقوں میں مزدور طبقہ وہ واحد طبقہ ہے جو نجی ملکیت سے مکمل عاری ہے، سب سے زیادہ منظّم ہے اور سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ جبکہ دوسری جانب ظالم سرمایہ دار طبقہ وہ واحد استحصالی

طبقہ ہے جس کے پاس نجی ملکیت اور پیداوار کا سب سے زیادہ ارتکاز ہے۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام اور اس سے جنم لینے والا آج کا طبقاتی معاشرہ وہ آخری معاشرہ ہے جس میں انسان ظالم اور مظلوم طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور مزدور طبقہ ہی وہ طبقہ ہے جو انسانوں کے اس آخری استحصالی نظام کو ختم کر کے انسانی معاشرے کو تاریخی ارتقاء کے نئے مرحلے میں، غیر طبقاتی معاشرے میں لے جانے کا اہل ہے۔

گزشتہ سماجی نظاموں کی طرح جن کے بطن سے نئے ظالم اور مظلوم طبقے پیدا ہوئے، سرمایہ دارانہ نظام کسی نئے ظالم اور نئے مظلوم طبقے کو جنم نہیں دے سکتا۔ مزدور طبقے کی آمریت کا نظریہ مارکس کے جملہ افکار میں مرکزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو مسترد کرنے والا خواہ مارکس کے افکار سے کتنا ہی مستفیض ہو، حقیقی مارکسسٹ نہیں ہوسکتا۔ یہی وہ نتیجہ تھا جو مارکس کو مزدور طبقے کی سیاسی جدوجہد میں کھینچ لایا اور اسے پوری دنیا کے مزدوروں اور محنت کش عوام کا ہر دلعزیز فلسفی اور سیاست دان بنا دیا۔ سیاست میں مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم بنانے کا سہرا بھی مارکس کے سر جاتا ہے۔ سرمایہ دار طبقے کے استحصالی راج سے مزدوروں کو نجات دلانا اور تمام انسانی معاشرے سے انسان کے ہاتھوں انسان پر ظلم کی ہر شکل کا خاتمہ کر کے ایک حقیقی خوشحال معاشرہ قائم کرنا جہاں ہر انسان امن اور چین کی زندگی بسر کر سکے یہی مارکس کی تمام تر فکری و عملی کاوشوں کا نچوڑ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مارکس آج قریباً دو سو سال بعد بھی دنیا کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دل میں زندہ و تابندہ ہے اور ان کے زین میں امید کی کرن بن جگمگاتا ہے۔ مارکس کی تدفین پر اس کے دیرینہ رفیق فریڈرک اینگلز نے درست کہا تھا کہ اس کا نام اور اس کا کام کئی عہد تک زندہ رہے گا۔

مارکس کی تعلیمات کا اثر ہر صنفِ ادب پر ہوا۔ مارکس کے نظریات کو متعدد ناقدین اور شعراء نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا اور اس کی کوششوں کو آگے بڑھایا۔ ذیل میں اُن چند اہم مفکرین کا تذکرہ پیش کیا جاتا ہے جنھیں اردو کے اُن بنیادگزار ادیبوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جنھوں نے مارکس کی فکر کو اپنی تحریروں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی:

علی سردار جعفری:

علی سردار جعفری اتر پردیش کے گونڈہ ضلع کے بلرامپور میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا تھا۔ ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور ۱۹۳۸ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ منزل شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے شاعری کا رُخ کیا۔ علی سردار جعفری نے اپنی انقلابی شاعری کی وجہ سے ۱۹۴۰ء میں گرفتاری کا سامنا کیا۔ وہ بھارت کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک رکن کے طور پر کام کرتے تھے اور اس کی ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں بھی متحرک رہے۔ اپنی شاعری کے ذریعے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ علی سردار جعفری جوانی سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ ناقدین نے ان کو اشتراکیت کا پروپیگنڈہ کرنے والا شاعر کہا۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''ان کی شاعری میں لہو کی عظمت و طاقت، حق گوئی و صداقت پسندی، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج، انقلاب کی خواہش اور بغاوت کی ترغیب، انسان دوستی، تاریخی ادراک و سماجی شعور، خطابت، عظمت انسان کا اعتراف، انسانی ہاتھوں کا قصیدہ، اشتراکیت، مارکسیت اور سوشلزم کے نظریات،

فطرت اور انسان کا باہمی رشتہ، عالمی امن وخوشحالی کا خواب اور ماضی، حال اور مستقبل کے صحیح تصور جیسے عناصر.....ان کی شخصیت اور فکر وفن کی پہچان بن گئے۔''(۱)

علی سردار جعفری لکھنؤ سے نیا ادب نکالتے رہے جس میں مجاز بھی ان کے ساتھ تھے۔ ۱۹۴۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ نیا زمانہ سے منسلک ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو حیدر آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہوئے۔ رفعت سروش نے اس بابت لکھا:

''کانفرنس کے دوران حیدر آباد میں سردار کی مصروفیات جدوجہد، انہماک اور Involvement دیکھ کر مجاز کے الفاظ پر یقین آیا کہ واقعی سردار جعفری ترقی پسندوں کا ظفر علی خاں ہے۔ آٹھ دن کی کانفرنس میں کوئی اجلاس ایسا نہ تھا جب سردار جعفری نے تقریر نہ کی ہو، کوئی ایسی تجویز نہ تھی جس پر سردار نہ بولے ہوں۔ سردار نوجوان تھے مگر بڑے بڑوں کو ان کے سامنے ریشہ خطمی ہوتے دیکھا۔''(۲)

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں تحریک آزادی زور پکڑ گئی۔ کمیونسٹ پارٹی نے آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ آزادی کے بعد سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کے پاکستان آنے سے سردار جعفری کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ آزادی ہند سے متعلق سردار جعفری نے لکھا:

نا گہاں شور ہوا
لو شبِ تار غلامی کی سحر آ پہنچی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں (۳)

ہندوستان میں آزادی کے کچھ ہی عرصہ بعد آزادی رائے پر مختلف طریقوں سے پابندیاں عائد کر دی گئیں خاص طور پر ترقی پسندوں پر کئی طرح سے حکومتی عتاب نازل ہوا۔ علی سردار جعفری کو بھی کئی ماہ آرتھر روڈ جیل میں گزارنے پڑے۔ ان کی گرفتاری نے تحریک میں نئی جان ڈال دی۔ کمیونسٹ پارٹی نے ادب سے زیادہ سیاست پر زور دیا۔ جبکہ علی سردار جعفری ادب اور سیاست کے باہمی تعلق کو اجاگر کرتے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''سیاست ہر جگہ ہے۔ ہر طرف ہے۔ فن اور ادب کی ہر تخلیق میں ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ کہیں سیاست ترقی پسند ہے اور کہیں رجعت پسند۔ جب فن پارے میں ترقی پسند سیاست ہوتی ہے تو فوراً انگلیاں اٹھتی ہیں۔ یہ فن نہیں ہے سیاست ہے۔ اور اگر سیاست رجعت پسند ہے تو وہ اعلیٰ درجے کا فن ہے۔ تفریح ہے۔''(۴)

علی سردار جعفری کے شعری مجموں میں پرواز، خون کی لکیر، نئی دنیا کی سلام، امن کا ستارہ، ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، پیراھن شرر، لھو پکارتا ھے شامل ہیں۔

ان کے نیا ادب کا پہلا شمارہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی سے پہلے شمارے میں ہی سردار جعفری نے 'ترقی پسند ادب' کے عنوان سے مضمون لکھا جس میں انہوں نے ترقی پسند تحریک اور اس کے ادب کے تصور کو واضح کرنے کی کوشش

کی۔اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں لکھتے ہیں:

''اس تحریک کا کارنامہ یہ کہے کہ اس نے ادب کے فرسودہ ساختی ڈھانچہ کو توڑ دیا اور اس جھوٹے تصور کو ختم کر دیا کہ ادب کا مقصد محض تفریح طبع ہے۔ جو مٹھی بھر پیٹ آدمیوں کی لطف اندوزی کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے۔ اسی نے اس اصول کی تبلیغ کی اور اسے منوالیا کہ ادب عوام کا ترجمان ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے اور ان کی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو کر اسے آگے بڑھاتا ہے۔'' (۵)

اپنے شعری مجموعے پرواز میں انہوں نے ایک نظم 'ترقی پسند مصنفین' کے عنوان سے لکھی جو مارکسی نظریات کی ہی پیش کش کہی جاسکتی ہے۔اس سے نمونہ ملاحظہ کیجیے:

آگ محفل میں غلاموں کی لگادیں اے دوست
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کردیں
کعبہ و دیروکلیسا کی بجادیں قندیل
ہرطرف مشرق و مغرب میں چراغاں کردیں
ڈال دیں وقت کی افسردہ نگاہوں میں نگاہ
عہد پارینہ کو اک خواب پریشاں کردیں
کھول دیں سب کے لیے قفل درمیخانہ
حضرت جوش کو سرحلقہ رنداں کردیں (۶)

علی سردار جعفری یکم اگست ۲۰۰۰ء کو ممبئی شہر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے (۷)۔

ڈاکٹر عبدالعلیم:

ڈاکٹر عبدالعلیم ایک ادیب، ماہرِ تعلیم اور مارکسی نقاد تھے۔ ۱۹۳۰ء کے اوائل میں جب وہ جرمنی گئے تو وہاں پر مارکسی نظریات کے ساتھ ان کا تعارف ہوا جس کے بعد بہت جلد انھوں نے اپنے فکری جھکاؤ کا ایک راستہ طے کرلیا۔ اس دور میں ترقی پسند لکھنؤ میں بہت سرگرم تھے اور خاص طور پر یونیورسٹی میں قومیت پسند، سوشلسٹ اور ترقی پسند ادیب بہت کام کر رہے تھے۔ عبدالعلیم نے ان تمام سرگرمیوں میں دلچسپی لینا شروع کی۔ ان کا پہلا انسلاک ۱۹۳۴ء میں شری جے پرکاش نارائن کی پونا میں قائم ہونے والی کانگرس سوشلسٹ پارٹی سے ہوا۔ وہ ایک طرح سے شریک بانی کے طور پر اس پارٹی سے منسلک ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں جب لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا باقاعدہ جلسہ منعقد ہوا تو سید سجاد ظہیر کے ساتھ انھوں نے انتظامی معاملات میں بڑا سرگرم حصہ لیا۔ ۱۹۳۸ء میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ترقی پسند اور کمیونسٹ نظریات کے حامل مجلّے نئے ہندوستانی ادب میں ملک راج آنند اور احمد علی کے ساتھ ادارتی بورڈ کے ممبر رہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی تحریروں جن میں بالخصوص ادب اور مارکسزم کا حوالہ دیا جاتا ہے، نے برصغیر کے لوگوں میں مارکسی نظریات کا شعور پہنچانے میں بڑا اہم حصہ ڈالا۔ اپنے نظریات اور سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر ڈاکٹر

عبدالعلیم کو ایک سال قید بامشقت بھی بھگتنا پڑی جو برطانوی سامراج کی طرف سے انھیں دی گئی تھی۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر عبدالعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۸ء میں انھیں اسی جامعہ کا وائس چانسلر تعینات کر دیا گیا۔ چار برس تک اپنی انتظامی خدمات انجام دینے کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اپنے ذہنی اور فکری رجحان کی تعلیم کے لیے بھی گراں قدر کام کیا۔ وہ کئی زبانوں کے عالم تھے اور ان تمام زبانوں میں اس موضوع پر ہونے والے کام پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا انتقال ۱۹۷۴ء میں ہوا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نے ہندوستانی معاشرے کو سامراجی شکنجے سے آزادی دلانے کا خواب اپنے دیگر ترقی پسند ساتھیوں کے ساتھ مل کر دیکھا اور پھر اس کی تعبیر کی تلاش میں لگ گئے۔ ترقی پسندی اور مارکسزم کے ساتھ ان کی وابستگی بہت گہری تھی۔ انگارے شائع ہوا تو اس میں شامل افسانوں نے پورے ملک میں ایک طرح سے مذہبی اور سماجی منافقت کے پردے کو چاک کرتے ہوئے آگ لگا دی۔ اس افسانوی مجموعے پر بہت زیادہ تنقید لکھی گئی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اُس وقت انگارے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہنامہ جامعہ میں ایک تبصرہ لکھا جس میں واضح کیا ہے بات کرنے اور بات نہ کرنے کا اختیار ہر انسان کا اپنا ہے، اُس کی اپنی رائے ہے، خواہ وہ جیسے بھی ظاہر کی جائے، سو اسے اس کا حق ہر صورت دیا جانا چاہیے اور دوسروں کو قبول بھی کرنا چاہیے۔ وہ انگارے کے افسانہ نگاروں کے طرز بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تنقید کی آزادی نہ ہو تو اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور وہ نخوت اور تکبر جو تنقید کی توہین، اختلاف کو عداوت اور خیالات کے بے تکلف اظہار کو بدتمیزی قرار دے، خلوص اور سچی عقیدت کا سب سے کٹر دشمن ہے لیکن اس پر غور کرنا زندگی کے ہر مصور کا فرض ہے کہ تنقید اور نکتہ چینی کا اس نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس کے مطلب کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ گالی دینا بھی خیالات اور خدمات ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے اور جسے خدا نے زبان دی ہے اس سے ہم گالی دینے کا حق چھین سکتے ہیں۔ مگر یہ سب جانتے ہیں کہ گالیاں دینے سے مطلب کہاں تک نکلتا ہے ہنسی اڑانے کے بھی بہت سے طریقے ہیں۔ بعض بات کو اس طرح سے ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ پھر کوئی ناصحانہ انداز ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بعض آدمی کو اتنا خفا کر دیتے ہیں کہ وہ پھر کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔''**(۸)**

ڈاکٹر عبدالعلیم نے اس مجموعی تاثر کی نفی کی ہے جو ترقی پسند فکر کے مخالفین کی طرف سے دیا جاتا ہے کہ ترقی پسند فکر اور تخلیقات میں سامعین کو مسترد یا نظر انداز کیا جاتا ہے۔ پریم چند کے بقول:

> ''مارکسزم کے بڑے نمائندوں نے ہمیشہ انسانیت کے قدیم ورثے کو عزت کی نظر سے دیکھا ہے اور برابر اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ مارکسزم کے معیاروں نے قدیم ورثے کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھا ہے۔''**(۹)**

انگریزی حکومت ہندوستان میں حکومت کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی ایک سیاسی کارکن اور پختہ

سیاسی بصیرت کے حامل مارکسسٹ ادیب ڈاکٹر عبدالعلیم کی دور بیں نگاہ انھیں اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ انگریزوں نے کچھ کانگرسیوں کو وزارت کے عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ اس کے سبب ان لوگوں کا رویہ حکومت برطانیہ کے تئیں نرم ہو گیا تھا۔ ملک کے مزدور کسان بدحال ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ سرمایہ دار اور زمیندار غریبوں پر مظالم کی انتہا کئے ہوئے تھے اس کے برعکس حکومت میں شامل کانگریسی وزیر خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ مخلص کانگریسیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ حکومت برطانیہ اور زمیندار ساہوکاروں کے جھانسے میں نہ آئیں۔ بلکہ مزدوروں اور کسانوں کو اپنی جماعت میں شریک ہونے کی دعوت دیں۔ عبدالعلیم مسلم لیگ کے سیاسی رجحان سے متفق نہیں تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسی پارٹی کا وجود ملک میں فروغ حاصل کرے جس سے فرقہ وارانہ ذہنیت کو تقویت حاصل ہو۔ لہٰذا اس وقت کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے کانگرسیوں کو یہ باور کرنے کی کوشش کی کہ کانپور کے کانگرسی مزدور کسانوں نے جس طرح سے مذہبی یک جہتی کا مظاہرہ کیا اور ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کیا ٹھیک اسی طرح پوری کانگرس پارٹی کو سارے ملک میں متحدہ محاذ قائم کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری:

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۱۲ر جون ۱۹۱۲ء کو رائے پور، برطانوی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا، سنسکرت زبان میں ایم اے کی سطح کا ایک ساہتیہ التکار کا امتحان بنارس یونیورسٹی سے پاس کیا۔ سوربون یونیورسٹی پیرس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اختر حسین رائے پوری اپنی ملازمت کے آغاز میں ایم اے او کالج امرتسر میں پروفیسر رہے، آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہے اور قیام پاکستان کے بعد محکمہ تعلیم میں ڈپٹی سیکرٹری اور مرکزی وزارت تعلیم میں مشیر ہوئے۔ اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے سے بھی منسلک رہے۔ عمر کے آخری حصے میں کراچی یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر علم و ادب اور فن و آگہی کے چراغ روشن کرتے رہے (۱۰)۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی شخصیت کا پہلا اور اہم ادبی حوالہ افسانہ ہے۔ ان کا پہلا اردو افسانہ 'زبان بے زبانی' کے عنوان سے نیاز فتح پوری کے مجلّہ نگار میں چھپا۔ اُن کے افسانوی مجموعوں میں محبت اور نفرت، زندگی کا میلہ اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے افسانے نامی تین کتب قابل قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ تاریخی و تنقیدی کتب میں جشن اور اطالیہ، ادب اور انقلاب، سنگ میل اور روشن مینار یادگار ہیں۔ تراجم میں گورکی کی آپ بیتی (تین جلدیں)، مقالات گارساں دتاسی (دو جلدیں)، شکنتلا، گڈارتھ کا اردو ترجمہ پیاری زمین، قاضی نذرالاسلام کی بنگالی نظموں کا اردو ترجمہ پیام شباب ہمارے ادب کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ اُن کی خود نوشت گردِ راہ اُردو نثر کی اہم ترین کتب میں شامل کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اردو، انگریزی، ہندی، سنسکرت، بنگالی اور فرانسیسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ فرانسیسی سے انہوں نے براہ راست بعض معروف تراجم کیے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زندگی کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرتے ہیں تو نوعمری میں ہی ان کی شخصیت میں سنجیدگی، متانت، ٹھہراؤ اور بلند ذہنی سطح کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہر دور میں ایسی شخصیتوں کا ظہور ہوا ہے جن کی ذہنی بالیدگی عام سطح سے بلند ہوتی ہے۔ اس میں کچھ دخل ان کے کردار، عمل اور ریاض کو ہوتا ہے اور کچھ اس

امر کی قدرت نے انہیں ذہن کی ان صلاحیتوں سے کام لینے کے قابل بنایا ہے جن تک عام ذہن کی رسائی ممکن نہیں۔ دیگر مشاغل کے علاوہ انہیں اپنے والد اور ان کے دوستوں کی گفتگو سننے کا موقع ملتا رہا جو عموماً سیاسی نوعیت کی ہوتی تھی۔ ہم عصروں کے برعکس وہ کھیل کود کے بجائے کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر دوستوں کو اپنے مطالعے کا حاصل سناتے رہتے۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے اختر حسین کے دل و دماغ میں کئی طرح کے سوالات سر اٹھانے گئے۔ اور وہ ان سوالات کے جوابات کی جستجو میں سرگرداں رہے۔ رائے پور میں قیام کے دوران اُن کی شخصیت میں تنہائی پسندی، مطالعے کا شوق، سیاسی جلسوں کی شرکت، کسانوں کی مفلوک الحالی کا مشاہدہ اور بیدار مغزی وہ عناصر نظر آتے ہیں جنہوں نے ان کو ان کی عمر سے کہیں زیادہ بڑا سوچنے اور سمجھنے کی طرف راغب کر دیا۔

جہاں تک ادبی میدان میں فکری راہیں واضح ہونے کا سوال ہے تو اُن کا مقالہ 'ادب اور زندگی' وہ اہم مقالہ لکھا جس نے نہ صرف اختر حسین رائے پوری کے اندر موجود ترقی پسند اور مارکسسٹ کو سامنے لا کھڑا کیا بلکہ اپنی اشاعت کے کچھ عرصے بعد ہی قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کے لیے بھی یہی مقالہ فکری اساس مہیا کرتا ہے۔ اسی مضمون کی بنا پر اختر حسین رائے پوری کو اُردو کے بنیاد گزار مارکسی دانشوروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بہت بعد میں طاہر مسعود کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ درحقیقت میں نے کبھی خود کو ترقی پسند نہیں کہا اور نہ ہی کچھ اس کا لیبل لگایا ہے۔ ترقی پسندی سے تعلق کے حوالے سے ان کا یہ معذرت خواہانہ بیان اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ترقی پسندوں کی سیاسی سرگرمیوں سے خود کو دور رکھنا چاہتے تھے ورنہ تو حقیقت یہی ہے کہ ترقی پسند تحریک ان کی فکری رہ نمائی کے بغیر پہلا زینہ نہیں چڑھ سکتی تھی۔ بیشتر ترقی پسندوں کا خیال ہے کہ اختر حسین اپنی منصبی و دفتری ذمہ داریوں کی نذر ہو گئے تھے۔ وہ انجمن کے لیے کوئی فعال کردار ادا نہ کر سکے۔ سجاد ظہیر نے اختر حسین سمیت ترقی پسندوں کے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت قبول کرنے کے عمل پر سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ علی سردار جعفری کی رائے میں اختر حسین نے اپنی تحریروں سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی بنیاد رکھنے میں ضرور مدد کی لیکن اس میں شامل نہیں ہوئے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا مجبوریاں تھیں کہ ایک باغی اور خلاق ذہن سرکاری دفتروں کی نذر ہو گیا۔ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے امرتسر اور دہلی میں انہیں مقامی انجمن کی صدارت دی گئی تو وہ موثر عہدے دار ثابت نہیں ہوئے بلکہ بتدریج تحریک سے لاتعلق ہوتے چلے گئے۔ جب اختر حسین نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تو اُن کی مخالفت میں شدت آ گئی۔ قیام پاکستان کے چند ماہ بعد اختر حسین کی سجاد ظہیر سے کراچی میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت کمیونسٹ سیاست نے متحدہ محاذ کی پالیسی ترک کر کے وہ روش اختیار کی جو زیڈ توف لائن کہلائی۔ اس کے مطابق وہ اہل قلم اب ترقی پسند نہیں رہے جو اس سیاست سے لاتعلق تھے۔ اختر حسین رائے پوری نے انہیں سمجھایا کہ اس نوزائیدہ مملکت کو استحکام کی ضرورت ہے اور یہاں قبائلی اور جاگیرداری نظام ایسا مضبوط ہے کہ پیش بین اور روشن خیال عناصر کا اتحاد ترقی پسندوں کا ضامن ہو سکتا ہے۔

۱۹۲۹ء میں برطانوی حکومت نے تقریباً پچیس اشتراکیت پسندوں کو گرفتار کر کے میرٹھ میں سازش کا مقدمہ قائم کیا۔ جس کی روداد تین سال تک اخبارات میں شائع ہوتی رہی۔ اسی کے باعث لوگوں کو اشتراکیت کی سن گن مل گئی۔ ان دنوں اختر حسین کو بھی اشتراکی ادب سے واقفیت کا شوق پیدا ہوا۔ صحافتی ضرورتوں کے تحت انہیں مختلف سیاسی جلسوں اور

ان کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے جانا پڑتا تھا۔اس سلسلے میں وہ مزدور کسان پارٹی کے دفتر بھی جانے لگے جو اشتراکی نظریات کے پرچار کیلئے بنائی گئی تھی لیکن حکومتی پابندیوں کے زیر اثر کھل کر کام نہیں کر سکتی تھی۔اختر حسین رائے پوری کہتے ہیں کہ جب میں دو چار بار اس (دفتر کے انچارج) سے مل چکا اور اسے میرے خلوص نیت پر اعتبار ہو گیا تو ان کے توسط سے انگلستان کے ڈیلی ورکرز، امریکا کے نیو میسن اور ماسکو میں قائم انٹرنیشنل پریس کوریسپونڈینس کے شمارے اختر حسین کے مطالعے میں آئے۔علاوہ ازیں بھگت سنگھ کے ساتھ مفرور کندن لال اور رابندر ناتھ ٹیگور کے بھانجے سمندر ناتھ ٹیگور کے توسط سے انہیں کارل مارکس، لینن اور دوسرے اشتراکی مفکرین کی بعض کتابیں پڑھنے کو ملیں۔علاوہ ازیں برنارڈ شاہ اور البرکامیو کی کتب بھی ان کے مطالعے میں آئیں۔اختر حسین کہتے ہیں کہ اس طرح میں انسانی معاشرے کی اُن بنیادی حقیقتوں سے واقف ہوا تھا جن پر اوہام وابہام کے پردے پڑے ہوئے تھے۔اس مطالعے کے اثرات نے انہیں اس قدر مسحور کیا کہ وہ جوش کے عالم میں کبھی ڈھاکہ ہاؤس میں کسان مزدور پارٹی کے دفتر کے چکر لگاتے اور کبھی کالج اسکوائر کے چائے خانوں میں بنگالی دوستوں سے دہشت پسندوں پر بحث کرتے۔اور پھر وشوامتر کے صفحات پر لرزہ خیز سرخیاں لگاتے۔ڈاکٹر انور سدید کے مطابق:

> ''کلکتے میں اختر حسین نے اپنی تعلیم کی طرف سے غفلت نہیں کی بلکہ ستمبر ۱۹۲۹ء کی تعطیلات موسم گرما کے بعد انہوں نے ودیا ساگر کالج میں داخلہ لے لیا۔اپنے ذہن پر کلکتے کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اختر حسین کہتے ہیں کہ میری خوش قسمتی ہے کہ جب میں رائے پور سے نکلا تو کلکتے گیا اور کلکتے میں میری ذہنی پرورش ہوئی۔چوں کہ میں اخباروں اور صحافیوں سے منسلک رہا اس زمانے کی سیاست اور ثقافت کے میدان میں کئی اہم لوگ تھے انہیں دیکھنے کا ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اس سے میرے ذہن کے بہت سے افق روشن ہوئے۔''(۱۱)

حمیدہ اختر نے بھی اختر حسین کی بھرپور سیاسی واشتراکی سرگرمیوں کی گواہی دی ہے۔اختر حسین ہر محفل اور ہر مقام پر سوشلزم کے پرچار کی کوشش کرتے تھے حتیٰ کہ وہ خواتین کو بھی اس نظریے کی دعوت دیتے دکھائی دیتے۔علی گڑھ میں اختر حسین اور ان کے ساتھیوں کے شب وروز کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ''اختر حسین علی گڑھ کے اس نوجوان اور ذہین ترقی پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے دوسرے اراکین مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، حیات اللہ انصاری، سبط حسن، شہاب ملیح آبادی، شرف اطہر علی، محسن عبداللہ اور علی اطہر وغیرہ تھے۔یہ اور ان کے دوسرے ساتھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بڑے بااثر طلبہ میں سے تھے۔ان کی حب الوطنی، روشن خیالی اور ان کا ادبی اور علمی ذوق اور زندگی میں ایک گرم جوشی اور آزاد خیالی ایسی دل کشی رکھتی تھی جس کی داستانیں میں جب انگلستان سے واپس آیا سنیں۔''(۱۲)

پروفیسر نذیر صدیقی کے خیال میں اختر حسین نے زندگی کو بندھے ٹکے نظریات کی عینک سے نہیں دیکھا۔وہ اپنے عقائد ونظریات میں ترمیم کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہے وہ ایک کھلے ذہن کے آدمی تھے انہوں نے زندگی کو مارکس اور

فرائیڈ کے فارمولوں سے الگ ہو کر بھی دیکھا ہے مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں:

''جمہوریت سے مراد حکومت پر جمہور کا اختیار اور اشتراکیت سے مراد اقتصادی وسائل پر جمہور کی حکمرانی ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور تشنہ ہے۔ ہر دو کا جواز فرد کی اصطلاح ہے میرا ذہن جمہوریت پر سرمایہ داری کے تسلط کو اسی طرح مسترد کرتا ہے جس طرح اشتراکیت پر کسی قسم کی ڈکٹیٹرشپ کو۔''(۱۳)

یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے فرسودہ تصورات، روایات، اعتقادات، رسومات اور بدنما تعصّبات کے حوالے سے ان کے قلم میں گہری نشتریت اور زہرناکی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی رعایت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ بلکہ ردعمل کی پرواہ کیے بغیر ایک بے رحم سرجن کی طرح نشتر چلاتے چلے جاتے ہیں۔ اختر حسین کے افسانے اسی شدید ردعمل کا نتیجہ ہیں مگر رومانی لہجے اور جدید مغربی افسانے کے گہرے مطالعے کے سبب وہ انگارے اور شعلے کے افسانوں کے برعکس کسی حد تک اعتدال اور توازن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اختر حسین رائے پوری نے ترقی پسند تحریک کو نظریاتی و فکری بنیاد فراہم کی۔ مگر ترقی پسندوں نے اس کا اعتراف بروقت نہیں کیا۔ جب انہیں احساس ہوا تو وقت گزر چکا تھا۔ ترقی پسندوں نے اختلاف کے باعث ان کے افسانوں کو نظر انداز کر دیا اور ان کو ترقی پسند تحریک کے حوالے سے موضوع نہ بنایا گیا۔ وگرنہ اختر حسین نے ایسے ایسے افسانے لکھے جن میں نہ صرف برصغیر کا اجتماعی شعور رواں دواں نظر آتا ہے بلکہ وہ تکنیکی سطح پر بھی جدید اردو افسانے کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ بہرکیف 'ادب اور زندگی' لکھ کر اختر حسین رائے پوری نے برصغیر کی ادبی تنقید اور بالخصوص ترقی پسند تحریک کو ایک نکتہ آغاز فراہم کیا۔ اس مقالے کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ اس مقالے کی بنیادی فکر یہ ہے کہ ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور زندگی اور ادب کا مقصد ایک ہی ہے۔ اس میں یہ بتانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارا سماج دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے ایک طبقہ اشرافیہ کا ہے اور اشرافیہ میں بھی وہ لوگ جو مذہب کی اجارہ داری رکھتے ہیں اور وہ مذہب کی آڑ میں اس طبقے کا استحصال کرتے ہیں جو عام انسانی طبقہ ہے۔ اس مقالے میں وہ ادیب کا معاشرے سے رشتہ جوڑتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ ایک عام انسان اور ایک ادیب کے فرائض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے(۱۴)۔ اختر حسین رائے پوری کے نزدیک ادب کا اصل معیار ہی یہی ہے کہ وہ انسانیت کا ترجمان ہو اور انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ ادیب پر لازم ہے کہ وہ معاشرتی حقیقت نگاری پیش کرے۔ سوویت انقلاب سے متاثر ہونے کے باعث اختر حسین ادب کو معاشی قدروں کے ساتھ ملا کر سمجھنے کی بھی کوشش کرتے رہے۔ اقتباس دیکھیے:

''قدیم ادب ہند میں معاشی تجزیہ" میں زمانہ قدیم میں برصغیر کی واضح اکثریت غریب کسانوں، کاشت کاروں، مفلوک الحال شودروں اور مظلوم عورتوں پر مشتمل تھی۔ لکھتے ہیں۔ "ملک کی آبادی کا 95 فیصد حصہ کسانوں پر مشتمل ہے لیکن میں نے آج تک کسی قدیم سنسکرت یا ہندی تصنیف میں ان کے حالات نہیں دیکھے۔ جابجا درندوں اور پرندوں کے رنج و راحت کا حال ہے۔ لیکن کسانوں کا نام تک کہیں نہیں ملے گا۔''(۱۵)

حوالہ جات

۱۔ رفیعہ شبنم عابدی، بہتے لہو کا محافظ، مشمولہ: کتاب نما :علی سردار جعفری نمبر (دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اپریل ۱۹۹۳ء)، ص ۱۸۲

۲۔ رفعت سروش، اک حرف انقلاب ہے سردار جعفری، مشمولہ: کتاب نما، علی سردار جعفری نمبر، ص ۷۶

۳۔ علی سردار جعفری، کلیاتِ علی سردار جعفری، جلد اول و دوم، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۴ء)، مرتبہ: علی احمد فاطمی، ص ۹۹

۴۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، (لاہور: مکتبہ پاکستان، ۱۹۵۶ء)، ص ۴۰

۵۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۷ء)، ص ۲۳۱

۶۔ کلیات سردار جعفری، ص ۹۵

۷۔ ایضاً، ص ۴۲، ۴۳

۸۔ عبدالعلیم، ادب اور مارکسزم، مشمولہ: ترقی پسند ادب، (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ء)

۹۔ پریم چند، ادب کی غرض و غایت، مشمولہ: ترقی پسند ادب

۱۰۔ مہر افشاں فاروقی، ماضی کا ستارہ: ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، روزنامہ ڈان، (کراچی: ۹ر دسمبر ۲۰۰۹ء)

۱۱، ۱۲۔ بحوالہ: ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۳ء)

۱۳۔ نذیر صدیقی، حسرت اظہار، (اسلام آباد: ماڈرن بک ڈپو، ۱۹۷۷ء)

۱۴۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، (حیدرآباد دکن: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳ء)، ص ۲۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۲